خلافت اور اس کا احیاء

.....قاری عابد محمود قریشی صاحب

خلافت کا مفہوم:

خلافت اگرچہ اپنی اصل اور اساس کے اعتبار سے عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن عربی زبان کے دوسرے اَن گنت الفاظ و کلمات کی طرح ہم اس لفظ کو اور اس کے مشتقات کو اردو میں بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں بڑی بے تکلفی سے لکھتے پڑھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ لفظ ''خلیفہ'' بھی خلافت ہی سے ماخوذ و مشتق ہے جس کا معنٰی ''نیابت'' اور وائسرائے شپ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ ''نیابت'' بھی خالصۃً عربی زبان ہی کا لفظ ہے' جسے اردو نے عربی سے مستعار لے لیا ہے۔ یوں خلیفہ کا معنی ''نائب'' ہو گیا۔

قرآنِ کریم میں حضرت آدمؑ اور حضرت داؤد علیہ السلام کو ''خلیفہ'' کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے **''واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفہ''** کا ترجمہ از خود ''ہمارا خلیفہ'' یا ''اپنا خلیفہ'' کر دیا ہے۔ حالانکہ اس میں دور دور تک کوئی ایسا لفظ تو کیا کوئی اشارہ یا کنایہ تک موجود نہیں جس سے ''ہمارا یا اپنا'' کا معنی مراد لیا جا سکے۔ لہٰذا قدیم اور جدید مفسرین و محققین نے اسکی تاویل و توجیہ یہ کی کہ انسانوں سے پہلے اس زمین پر ایک آتشیں اور ناری مخلوق رہتی بستی تھی۔ جنہیں جنات کہا جاتا ہے۔ تب ہماری اس زمین پر ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ پھر لاکھوں سالوں تک اس زمین پر تند و تیز بارشیں برستی رہیں۔ جنکی وجہ سے اس زمین کا درجہ حرارت اعتدال میں آیا۔ اور یہ زمین روئیدگی اور زندگی کے قابل ہوئی۔ تب اس زمین پر انسان اور دوسری لاتعداد مخلوقات معرضِ وجود میں آئیں۔ ابھی تک اس بات کے سو فیصد یقینی شواہد نہیں مل سکے کہ اس کرۂ ارضیہ کے علاوہ اجرامِ سماویہ میں سے اور کسی جرم سماوی/کرۂ سماویہ پر بھی انسان یا دوسری مخلوقات کا وجود پایا جاتا ہے۔ لیکن اب بعض سائنسدانوں نے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مریخ پر ماضی میں زندگی یقیناً موجود رہی ہے کیونکہ وہاں زندگی کے تمام تر عناصر کے موجود ہونے کے شواہد مل گئے ہیں۔ جب اس زمین پر جنات بستے تھے تو اس زمین کا نظام بھی جنات ہی چلاتے تھے۔ اب انسان اور دوسری لاکھوں مخلوقات معرضِ وجود میں آ گئیں۔ لیکن ان لاکھوں مخلوقات میں سے کوئی ایک مخلوق بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس زمین میں کوئی تصرف کر سکے۔ انسان چونکہ اپنے پروردگار کی طرف سے اعلیٰ قسم کی عقلی اور بدنی صلاحیتیں اور ارادۂ اختیار لے کر آیا تھا' اس نے زمین کا تصرف و اختیار سنبھالا۔ اس لیے انسان جنات کا نائب اور خلیفہ کہلانے لگا۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جب انسان کو خلافت کا یہ منصب عطا کیا گیا تو اس سے یہ عہد بھی لیا گیا کہ وہ اللہ کے نازل کردہ ضوابط و قوانین کے مطابق زندگی گزارے گا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ سیاسی نظام کے بارے میں بولا جانے لگا۔ خود ہمارے پیارے نبی کریم حضرت محمد ﷺ نے بھی اسے سیاسی نظام ہی کے طور پر استعمال فرمایا اور بخاری شریف میں آنے والی روایات میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت و سیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام فرمایا کرتے تھے'' یعنی وہ یا تو بذاتِ خود حکمران ہوتے یا حکمرانوں کا تعین ان کے حکم سے ہوا کرتا تھا۔ اور تاریخ اس بات کی پوری پوری تائید و تصدیق کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر پر 80 سال بلا شرکت غیرے حکومت کی۔ آپ چونکہ مصر کے مقامی باشندے نہیں تھے بلکہ شام/فلسطین سے آ کر جو اس وقت کنعان کہلاتا تھا' آباد ہوئے تھے۔ آپؑ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد مصر میں ایک سیاسی تحریک شروع ہوئی کہ ان غیر ملکیوں کو یہاں سے نکالو۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ ان کے بچوں میں عورتوں کو چھوڑ دیا جائے اور مردوں کو وقفے وقفے سے قتل کر دیا جائے۔ یہ عمل چار سو سال تک جاری رہا۔ تب تک بنی اسرائیل کے بارہ اسباط کی اولاد چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اب ان میں حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ یعنی انبیاء ہی انکی قیادت فرما رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام انہیں مصر سے لیکر نکلے تو اللہ نے انہیں حکم دیا کہ فلسطین کے لوگوں سے جنگ کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ سرزمین عطا فرما دیں گے۔ بنی اسرائیل نے صاف کہہ دیا کہ اے موسیٰؑ تو اور تیرا رب جا کر ان تندرست و توانا لوگوں سے لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس کی پاداش میں انہیں چالیس سال صحرا میں بھٹکنے اور سر پٹکنے کی سزا دی گئی۔ آخر کار اللہ کے ایک اور نبی حضرت یوشعؑ بن نون نے ان کی قیادت سنبھالی اور انہوں نے فلسطین پر حملہ کیا۔ فلسطین کا ایک شہر ''اریحا'' انہوں نے فتح کر لیا اور آخر کار پورا فلسطین فتح کر لیا۔ غلطی یہ کی کہ ایک متحدہ حکومت بنانے کی بجائے بارہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنا لیں۔ اب وہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے لڑنے لگے اور قرب و

جوار کے لوگ بھی ان پر حملے کرنے لگے۔ اپنی اس صورتِ حال سے تنگ آ کر یہ اللہ کے ایک اور نبی حضرت سیموئیل علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے عرض کیا کہ ہمارا ایک کمانڈر مقرر فرما دیجئے۔ حضرت سیموئیل علیہ السلام نے حضرت طالوت کو ان کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ حضرت طالوت نے 16 برس حکومت کی اور پھر حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے تخت کا جانشین بنا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے چالیس برس حکومت کی اور پھر اقتدار و حکومت ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آ گیا جو کہ چالیس برس تک رہا۔ اس طرح دیکھ لیجئے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کی سیاست انبیاء کرام ہی فرما رہے تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کے سیاسی معاملات حضرات انبیاء کرام ہی نمٹایا کرتے تھے۔

اب ہم اپنے سیاسی نظام کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ مسلمانوں کے لیے ہر اعتبار سے ایک نمونہ کامل ہیں۔ ریاستِ مدینہ قائم ہو جانے کے بعد سیاسی اقتدار و اختیار کی تمام تر قوتیں بھی حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھیں۔ اور حضور ﷺ نے اللہ کی ہدایات کی روشنی میں ایک نظامِ سیاست و ریاست و حکومت قائم کر کے دکھا دیا۔ جو کہ سراسر احکامِ الٰہیہ اور تعلیماتِ ربانیہ کی بنیاد پر قایم تھا۔ حضور ﷺ جب تک اس منصب پر جلوہ افروز رہے وہ اس نظام کو چلاتے رہے۔ لیکن آخر کار حضور ﷺ کو بھی ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر اپنے رب کریم و رحیم کے پاس جانا تھا' اور آپ ﷺ چلے گئے۔ حضور ﷺ کی بے شمار دوسری خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حضور اللہ کے آخری نبی و رسول تھے۔ حضور ﷺ کے بعد کسی قسم کے کسی نبی کے آنے کا کوئی امکان و احتمال نہیں تھا۔ تو قدرتی طور پر یہ سوال اٹھا کہ اب سیاسی نظام کس کے ہاتھ میں ہوگا۔

انسانیت کی ایک بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ حضور ﷺ جو دین لے کر آئے وہ ہر اعتبار سے کامل اور مکمل تھا۔ اس لیے خود حضور ﷺ نے اس کے بارے میں فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی تو نہیں آئے گا' البتہ میرے بعد خلفاء ہوں گے۔ جو اس سیاسی نظام کو سنبھالیں گے۔ اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ نے بیان فرما دیا کہ امتِ مسلمہ کے سیاسی نظام کا نام ہے ''خلافت''۔ یعنی ایک مسلمان حاکم رسول اللہ ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے اپنی حکمرانی کی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے اور 'خلیفہ'' کہلاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آنے والا یہ واقعہ ہے جسے اسلامی سیاست کی معروف ترین کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور آپؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر مخاطب کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ''لست بخلیفۃ اللہ' انا خلیفۃ رسول اللہ'' کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں' بلکہ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ بعد ازاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو 'خلیفۃ رسول اللہ'' کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اس طرح فقہاء امت نے بھی ''خلیفہ'' کا معنی و مفہوم بیان کرتے ہوئے جہاں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ''خلیفہ'' اسے کہتے ہیں جو امت کے سیاسی و اجتماعی امور انجام دے' وہاں پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ ''نیابۃ عن النبی ﷺ' کہ اس کی حیثیت حضور کے نائب کی ہوگی''۔

اب جب حضرت ابوبکر صدیقؓ رحلت فرما گئے اور حضرت عمر بن الخطابؓ خلیفہ بن گئے تو انہیں ابتداء میں ''یا خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ'' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ فطری بات ہے کہ آپؓ تک تو کلمہ ''خلیفہ'' کی تکرار صرف دو مرتبہ تھی۔ آپؓ کے ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہوگا کہ میرے بعد تو یہ تکرار بڑھتی چلی جائے گی۔ اس صورتِ حال میں بعض روایات کی رو سے باہر سے آنے والے ایک اسلامی وفد نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو ''امیر المومنین'' کے لقب سے پکارا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو یہ لقب بہت پسند آیا۔ اور بعض روایات میں آیا کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے آپؓ کو ''یا امیر المومنین'' کہہ کر مخاطب فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے اس خطاب کو پسند فرمایا اور سب کو کہہ دیا کہ آئندہ انہیں امیر المومنین ہی کہہ کر مخاطب کیا جائے۔ شاید اس بنیاد پر بعض لوگ ''خلافت'' کو ''امارت'' یا ''امارتِ شرطیہ'' بھی کہہ دیتے ہیں۔

مختصر تاریخ خلافت

''خلافت'' کا معنی و مفہوم جان لینے کے بعد اب آیئے ذرا ایک نظر خلافت کی مختصر تاریخ پر بھی ڈال لیں۔

نوٹ: یہ سطور لکھتے ہوئے قاری عابد محمود قریشی صاحب' مدیر مسئول ''سبق پھر پڑھ'' اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ دعا ہے اللہ پاک ان کی قبر کو روشن و منور فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں جنت کے بہترین حصوں میں داخل فرمائے۔

انتقال پر ملال

تمام سبق پھر پڑھ کے قارئین کو اور دوسرے تمام دوستوں کو انتہائی دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ تحریک کے انتہائی اہم سرگرم کارکن اور ماہنامہ ''سبق پھر پڑھ'' کے مدیر جناب قاری عابد محمود قریشی صاحب رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔ مرحوم نہ صرف تحریکِ عظمتِ اسلام کا ایک قیمتی سرمایہ تھے بلکہ ان کی وفات امتِ مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ دین اسلام کیلئے مرحوم کی اندرون و بیرون ملک بے شمار خدمات ہیں۔ جن کا شمار ممکن نہیں۔ آپؒ جامعہ اشرفیہ کے ساتھ بھی درس و تدریس کے سلسلے میں منسلک تھے۔ اور لاہور پریس کلب کی جامعہ مسجد کے خطیب بھی تھے۔ آپؒ کی تحریک کیلئے بے شمار خدمات ہیں جن کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ انتہائی سرگرم اور تحریکی انسان تھے۔ نہایت شفیق تھے۔ تحریک کے لیے ان کی جدوجہد اپنے اندر آپ ایک لازوال داستان ہے۔ آپؒ نے اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ دین کیلئے وقف کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک بھی آپؒ ''خلافت کا احیاء'' کے نام سے مضمون تحریر کر رہے تھے۔ جو کہ ان کی وفات سے ادھورا رہ گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی قبر کو روشن و منور فرمائے۔ اور دین کے لیے کی گئی ان کی کاوشوں کو اعلیٰ درجے میں قبول و منظور فرمائے۔ آمین!

یہ بگڑتا نظام

.....ڈاکٹر زاہد اشرف

اگر ہم من حیث المجموع اپنے پورے نظام کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم کیے بنا چارہ نہیں کہ اس کا بگاڑ دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہر گزرتا دن اس کے فساد میں اضافہ کر رہا ہے' اس کی بدبو بڑھ رہی ہے' اس کے تعفن نے جینا محال کر دیا ہے۔ یہ صورتِ حال اب کی نہیں' دہائیوں کی ابتری سے پورا نظام متعفن ہو چکا ہے۔ آج بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اور اب سے چار پانچ دہایاں پہلے بھی یہی رونا رویا جاتا تھا' ہم نے تو اپنی شعوری زندگی میں یہی کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اہلِ دانش و بینش یہی کچھ کہتے رہے ہوں۔

اس نظام کا فساد اور بگاڑ آپ اپنے اردگرد چار سو دیکھیں گے' آگے' پیچھے' دائیں اور بائیں بلکہ آپ کوشش جہات میں یہی کچھ دکھلائی دے گا۔ آپ کے سر پر بھی اس فساد کی چادر تنی ہو گی اور آپ کے پاؤں بھی اسی بگاڑ کی دلدل میں دھنسے ہونگے۔ آپ کا سرکاری و غیر سرکاری' اقتصادی و معاشی' سیاسی و انتظامی' عدالتی و قانونی' صنعتی و تجارتی' تمدنی و معاشرتی' تعلیمی و تربیتی' صحافتی و ابلاغی الغرض ہر شعبہ حیات فساد کی آماج گاہ بنا ہوا دکھلائی دے گا۔

ہمارے ملک میں سیاست کو عبادت کہنے والوں نے غلاظتوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ کیا حزبِ اقتدار اور کیا حزبِ اختلاف' ان کی زبانیں سوائے گندگی کے کچھ انڈیل ہی نہیں پاتیں۔ ایک دوسرے کیلئے ان کے منہ سے جھڑنے والے ''پھول'' سرانڈ بکھیرنے کے سوا کچھ بھی تو نہیں کر پاتے۔ ایسے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ شرافت و نجابت سر پیٹ کر رہ جائیں۔ ''گل افشانیاں'' ہر سو' ہر سطح پر ہو رہی ہیں۔ ہر پلیٹ فارم کو اس کام کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے اور ہر قسم کے میڈیا پر اس کے بدترین مظاہر بکھرے پڑے ہیں۔ جلسے جلوس' ریلیاں' دھرنے' پریس کانفرنسز' سوشل میڈیا اور نہ جانے کہاں کہاں گل افشانیوں کی غلاظتوں نے پورے ماحول کو مکدر ہی نہیں کیا' اسے بدبودار بھی بنا دیا ہے۔ ہر رات الیکٹرانک میڈیا پر جو بازار سجتے ہیں وہ ''اس بازار'' سے کچھ مختلف تو نہیں ہوتے۔ ان میں صرف زبانی کلامی لڑائی ہی نہیں ہوتی' بعض اوقات مار کٹائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دونوں احزابِ سیاست.....حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف سے وابستہ لوگ بدکلامی کی انتہا کر دیتے ہیں۔ اپنے اوپر عائد ہونے والے الزام کا جواب دینے کی بجائے دوسروں پر الزامات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ اپنی غلاظتوں کو دھونے کی بجائے دوسروں پر غلاظتیں اچھالی جاتی ہیں۔ سوشل میڈیا تو ان سب پر بازی لے گیا ہے۔ وہاں گالی کی کون سی صنف ہے جس کی طبع آزمائی اپنے نظری و فکری اور سیاسی مخالفین پر نہ کی گئی ہو۔ وہاں ایسی ایسی گندی اور غلیظ گالیاں دی جاتی ہیں کہ انسانیت بھی چلو بھر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے' سیاست دانوں کی یہ غلاظت دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

انتظامی حوالے سے بھی دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ فساد انتظامیہ کے اندر کا ناسور بن چکا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بہتر انداز میں کام کرنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ انتظامی مشینری کا کوئی کل پرزہ نہ کل درست کام کر رہا تھا اور نہ آج کر رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب ہر دور میں اہلیت و میرٹ کا قتلِ عام کرتے ہوئے من پسند افراد

کی اعلیٰ مناصب پر تقرری ہی ہوتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ کرپشن اور بدعنوانی کا تڑکا بھی لگ جائے تو فساد اور بگاڑ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہے اور پھر اربوں نہیں کھربوں ڈکار لیے بغیر ہضم کر لیے جاتے ہیں۔ ماضی اور آج کی کرپشن کی داستانیں سن کر بھی اگر ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں تو پھر صورِ اسرافیل ہی ہمیں جگا پائے گا۔

انتظامی فساد اور بگاڑ کا ایک خوفناک پہلو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں آئے دن بے گناہوں کا گھناؤنا قتل ہے۔ کبھی یہ کام باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں ہوا' جیسا کہ ن لیگ کے دورِ حکومت میں سانحہ ماڈل ٹاؤن لاہور اور کبھی تحریکِ انصاف کے دور میں سانحہ ساہیوال کے روپ میں یا اب اسلام آباد میں اسامہ ستی کے وحشیانہ قتل کی صورت میں' اداراتی شکل میں۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکمرانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں میں خوف خدا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اس ادارے سے وابستہ یہ قاتلین ایمان بالآخرت کے عقیدے سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ انہیں شاید یہ احساس تک ہی نہیں کہ روزِ قیامت انہیں اپنے ان بہیمانہ اقدامات کا جواب دہ بھی ہونا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ ''اگر زمین و آسمان کے سبھی لوگ ایک مسلمان کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھے منہ جہنم میں گرا دیں گے''۔ کیا ماضی اور آج کے حکمرانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ان اہلکاروں نے..... جو بے گناہوں کے قتل میں مرتکب ہوئے ہیں..... یہ کبھی سوچا کہ آخرت میں ان کے ساتھ کیا بیتے گی؟

اس عقیدۂ آخرت اور وہاں کے نظامِ جزا و سزا کے تصور سے بے گانگی نے ہمارے سرکاری و غیر سرکاری ہر ادارے میں فساد اور بگاڑ کو اپنی انتہاء تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے نظام میں عدل و انصاف کے قتل اور احتساب کے ٹھوس منصفانہ نظام کی عدمِ فعالیت نے بدعنوان اور قانون شکن افراد کو دنیوی سزا کے خوف سے بھی عاری کر کے ان کی شیطنت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فساد شش جہات میں تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔

اس بدترین صورتِ حال کا فوری ازالہ صرف نظامِ عدل (نظامِ خلافتِ راشدہ) کو منصفانہ بنیادوں پر استوار کر کے ہی ممکن ہے۔ خلافتِ راشدہ کا سا نظام جس میں کوئی سا بھی لٹیرا' ڈاکو' قاتل' کوئی سا بھی اثر و رسوخ رکھنے والا' کسی بھی مافیا کا کوئی سا بھی رکن' منی لانڈرنگ کرنے والا اشرافیہ کا کوئی سا بھی فرد' قانون توڑنے والا کوئی سا بھی شخص' کسی بھی سائل کے جائز مسئلے کو حل نہ کرنے والا کوئی سا بھی افسر یا سرکاری اہل کار اپنے جرم کی سزا بھگتے بغیر نہ رہے۔ ایسا کرنے سے فوری طور پر جرائم میں کمی ہو گی اور فساد و بگاڑ میں کمی واقع ہو گی۔ جبکہ طویل المدت پروگرام کے تحت تعلیم و تربیتی نظام کو تعلیمی اداروں میں ہر سطح پر نافذ کرنا ہو گا تا کہ مستقبل میں ایسی نسلیں پورے نظام کو سنبھال سکیں جو دنیا و عقبیٰ میں جزا و سزا کے نظام پر پختہ یقین رکھتی ہوں اور اپنا ہر عمل اسی کی روشنی میں سرانجام دینے کی خوگر ہوں اور تبھی ایک اچھے معاشرے کی تشکیل و نفاذ کو یقینی بنایا جا سکے گا۔

ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟

.....عبدالسلام عمر

الحمدللہ ہم مسلمان اس حقیقت پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتے ہیں کہ اس سلسلہ کون و مکان کا خالق و مالک اور اسے چلانے والی ہستی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی دیگر مخلوقات کی طرح بنایا اور اس کی ہدایت کیلئے انسانوں میں سے ہی انبیاء و رسلؑ کا انتخاب فرمایا جن کو ایک جانب وحی کے ذریعے سے ہدایت بخشی اور دوسری جانب ان انبیاء و رسلؑ کی زندگی کو دیگر انسانوں کیلئے صراطِ مستقیم پر زندگی گزارنے کا ''نمونہ'' بھی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی میں سے دنیا کی زندگی کو ''امتحان و آزمائش'' قرار دیا اور اس امتحان کے نتیجہ کا دن یوم آخرت کو قرار دیا یعنی وہ یوم الدین (بدلے کا دن) اور یوم التغابن (ہار جیت کا دن) ہے۔ دینِ اسلام ہم ماننے والوں سے کیا مطالبہ کرتا ہے یعنی دینِ اسلام کی چاہت کیا ہے کہ مسلمان کیسی زندگی گزاریں؟ یا آسان الفاظ میں یہ کہ عمل کرنے کی وہ کون سی لازمی باتیں ہیں جن سے ہمارا رب راضی ہوتا ہے اور جو ہمارے بنانے کا مقصد بھی ہیں۔ ذیل میں ہم ان باتوں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مختصراً کلام کریں گے۔

عنوان کی طرف نظر دوڑائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارا دین اسلام کے بارے میں کیا تصور ہے؟ یعنی کیا ہم اسے محض چند مذہبی رسومات اور عبادات کے طور طریقوں تک ہی محدود سمجھتے ہیں یا پھر اس سے بڑھ کر اسے کل زندگی کیلئے قابل عمل ''مکمل ضابطہ حیات'' مانتے ہیں؟ کیونکہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جیسا اور جتنا تصور ہو گا ویسا اور اتنا ہی عمل ہو گا۔ اگر تصور محدود اور جامد ہو گا تو عمل میں بھی محدودیت اور جمود واضح طور پر دکھائی دے گا اور اگر تصور جامع اور حرکی ہو گا تو عمل میں بھی جامعیت اور تحریک نمایاں ہو گی۔

ہمارے عنوان کے الفاظ پر غور کریں ان میں ''دینِ اسلام'' سے مراد زندگی گزارنے کا وہ طریقہ ہے جو اللہ پاک کی دی گئی ہدایات کے مطابق ہو جبکہ لفظ ''ہم'' سے مراد ہم مسلمان (ماننے اور تسلیم کرنے والے) چاہت سے مراد دینِ اسلام کی چاہت یعنی مطالبات ہیں۔ اس مختصر سی وضاحت کے بعد ہم کچھ تفصیل بیان کریں گے۔

دینِ اسلام کا جامع تصور یہ ہے کہ یہ دین تمام کائنات اور تمام انبیاء کرام کا دین ہے اور اس کی بنیادی خاصیت یہ ہے کہ یہ سرتاپا اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری پر مشتمل ہے مزید یہ کہ یہ زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے یعنی اس میں انفرادی زندگی کے تین گوشے 1- عقائد 2- عبادات 3- رسومات اور اجتماعی زندگی کے تین گوشے یعنی 1- معاشرتی نظام 2- معاشی نظام 3- سیاسی نظام شامل ہیں۔

اگر آپ سب حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے تو ہم اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں اور وہ اپنا نفاذ مانگتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ایک بندہ مومن کیلئے ضروری ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائے۔

اگر اسلام پر پورا عمل کرنا ہے تو ایک بندہ مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے سامنے دین کا مکمل نظام واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس کام کیلئے جو چیز سب سے پہلے چاہیے یا اس کام کا جو نکتہ آغاز ہے وہ ہے: ''ماننا'' ماننے کی دینی اصطلاح ہے ''ایمان''۔ ایمان دو طرح کا ہوتا ہے۔

1- ظاہری: اقرار باللسان' قانونی ایمان' اسلام

2- باطنی: تصدیق بالقلب' حقیقی ایمان

اس سے یہ بات سامنے آئی کہ اصل ایمان والے وہ ہیں جن کے دل میں ایمان ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجئے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں' اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ (الحجرات: 14)

حقیقی ایمان کے دو تقاضے ہیں:

1- یقین 2- جہاد فی سبیل اللہ

''مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولؐ پر پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوے ایمان میں) سچے ہیں'' (الحجرات)۔

ہم جس ایمان کی بات کریں گے وہ ہے یقین والا حقیقی ایمان اور جب کسی چیز پر یقین آ جائے تو اس سے عمل خود بخود پھوٹتا ہے۔ ہر مسلمان سے دین کے تین بنیادی تقاضے ہیں:

پہلا مطالبہ: اطاعتِ دین

کیونکہ یہی ہماری تخلیق کا مقصد ہے۔

''نہیں پیدا کیا ہم نے جنوں اور انسانوں کو سوائے عبادت کے'' (الذاریات)۔

آج ہم نے اپنی عبادت کو صرف اور صرف عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ جبکہ عبادت لفظ عبد سے نکلا ہے اور عبد کہتے ہیں غلام کو۔ غلام 24 گھنٹے کا غلام ہوتا ہے اور اسے ہر وہ کام کرنا ہوتا ہے جو اس کا آقا کہے۔ لہٰذا عبادتِ رب کا مطلب ہے اللہ کے تمام احکامات کو ہمہ وقت ماننا۔ اس لیے ہمیں عبادات دی گئیں تا کہ عبادتِ رب آسان ہو جائے۔ انسان لفظ نسیان سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے بھول جانے والا۔ لہٰذا:

نماز: پانچ وقت یاددہانی ہو جائے۔ (ایاک نعبد وایاک نستعین)

روزہ: تا کہ نفس کے منہ زور گھوڑے پر قابو پایا جا سکے۔

زکوٰۃ: مال کی محبت سے دل کو پاک کیا جا سکے۔

حج: قومی محبت سے دل کو پاک کیا جا سکے۔

اگر آپ خود عبادت کر رہے ہیں تو اس سے عبادت آگے پھیلنی چاہیے۔ جیسے برف کی سل سے ٹھنڈک پھیلتی ہے اور آگ کے انگاروں سے گرمی۔ اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اس کی محبت سے سرشار ہو کر کی جائے اور اطاعت جزوی اور من چاہی نہ ہو بلکہ غیر مشروط طور پر ہو جیسے غلام اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے۔

دوسرا مطالبہ: دعوتِ دین

یہ تو ایک منطقی نتیجہ ہے اس بارے میں قرآنِ مجید کا کیا حکم ہے:

"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینهون عن المنکر واولئک هم المفلحون" (آلِ عمران)۔

"وکذلک جعلنکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا" (البقرۃ:143)۔

"کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون بالله" (آلِ عمران:110)۔

ہم اللہ کے رسول ﷺ کے رسول ہیں۔ کیونکہ تکمیل رسالت کے بعد اس کو آگے پہنچانے کا کام امتِ محمدیہ کو سونپا گیا۔ دعوت دین کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک آپ اس کا ایک نمونہ دکھا دیں۔ جب تک آپ اس نظام کو چلا کر نہ دکھا دیں دعوتِ دین مکمل نہیں ہو سکتی اور عبادت رب کامل نہیں ہو سکتی جب تک وہ نظام قائم نہیں ہو گا۔

تیسرا مطالبہ: اقامتِ دین

"اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) اٹھیے اور لوگوں کو خبردار کیجئے اور اپنے رب کی بڑائی کرو" (المدثر)۔

"وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تا کہ غالب کر دے اس کو پورے نظام زندگی پر" (التوبہ:33، الصّف:9، الفتح:28)۔

"قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو" (الشوریٰ:13)۔

تفرقہ کہتے ہیں پھاڑ دینے کو۔ ایک حصے پر عمل کر لو اور ایک حصہ کو چھوڑ دو۔ دیکھئے یقین کی کوکھ سے نکلے ہیں یہ تینوں فرائض اور ان کیلئے جو جستجو اور کوشش کی جائے گی اس کی دینی اصطلاح جہاد ہے اور جب اس جہاد کا مقصد اللہ کے دین کی سربلندی ہو تو یہ جہاد فی سبیل اللہ ہو جائے گا۔ اور ایمان کی دونوں شرطیں پوری ہو جائیں گی۔ ان تینوں فرائض کو پورا کرنے کیلئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے جماعت اور کسی بھی با مقصد کام کیلئے اجتماعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت:

دین اسلام میں اہم امور زندگی اور شعائر دینی کی ادائیگی کیلئے اجتماعیت اختیار کرنے کی انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً سفر کے حوالے سے ہدایت ہے کہ "جب تم میں سے تین آدمی سفر پر نکلیں تو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں"۔ تمام ارکان اسلام یعنی نماز، روزہ، اموال ظاہر پر زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی اجتماعی نظم کے تحت ہوتی ہے۔ نمازِ جمعہ اور عیدین کی ادائیگی بغیر اجتماعیت کے ممکن نہیں۔ اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں:

1- انفرادی زندگی میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لیے صادقین کی صحبت سے استفادہ ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اے اہلِ ایمان: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرو" (التوبہ)۔

اگر آدمی اکیلے زندگی بسر کر رہا ہے تو کون اس کی اصلاح کرے گا؟ جماعتی زندگی کی یہ برکت ہے کہ ساتھی خامیوں کی اصلاح کرتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کا تزکیہ ہوتا رہتا ہے۔

2- دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینے کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو خیر کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں" (آلِ عمران:104)۔

3- سورۃ المائدہ رکوع نمبر 4 میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے دو جلیل القدر رسول حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ باوجود شدید خواہش کے دین کو غالب نہ کر سکے

کیوں کہ قوم نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ گویا بغیر اجتماعیت کے دین کے غلبے کی جدوجہد کامیاب نہیں ہو سکتی۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم پر جماعت کا التزام کرنا لازم ہے اور یہ کہ جدا ہونے سے بچو۔ پس بے شک شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دو سے نسبتاً زیادہ دور رہتا ہے۔ جو کوئی جنت کی خوشبو کا طلبگار ہو پس وہ جماعت کے ساتھ جڑا رہے''۔ (رواہ ترمذی)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ بے شک اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جو کوئی جماعت سے علیحدہ ہوا' وہ علیحدہ کر دیا گیا جہنم کی طرف''۔ (الجامع الصغیر)

حضرت حارث الاشعریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا: ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ جماعت کے ساتھ ہو جاؤ' سنو اور مانو اور ہجرت کرو اور جہاد فی سبیل اللہ کرو''۔ (ترمذی' مسند احمد)

☆اجتماعیت کیلئے بیعت کی اساس مسنون ہے:

نبی اور امتی کا رشتہ انسانی زندگی کا اہم ترین رشتہ ہے۔ کسی ہستی کو نبی مان لینے کے بعد اس کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہے اور نافرمانی سے انسان کا ایمان ہی معتبر نہیں رہتا۔ (سورۃ الاحزاب: 36) لہٰذا نبی کریم ﷺ کو اس کی ضرورت نہ تھی کہ اپنے امتیوں سے سمع و طاعت کی بیت لیں۔ لیکن آپ ﷺ نے بعد میں آنے والوں کیلئے ایک سنت جاری فرمائی اور مختلف مواقع پر صحابہ کرامؓ سے بیعت لی۔ اس سلسلے میں چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

1- 12 نبویؐ میں اہلِ یثرب سے لیلۃ العقبہ میں بیعت لی گئی۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ

2- 13 نبویؐ میں اہلِ یثرب سے بیعت لی گئی۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ

3- 5 ہجری میں غزوۂ احزاب سے قبل خندق کی کھدائی کے دوران کا ایک واقعہ جس میں بیعتِ جہاد کا ذکر ہے: ''ہم ہیں وہ جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر رہتے دم تک جہاد کیلئے بیعت کی ہے''۔

4- 6 ہجری میں صلح حدیبیہ سے قبل بیعتِ رضوان (خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کیلئے)

5- خواتین سے بیعت۔ بیعت النساء (سورۃ الممتحنہ: 12)۔

اجتماعیت کیلئے بیعت کی اساس ماثور ہے یعنی سلف و صالحین سے اسی اساس کا ثبوت ملتا ہے۔ البتہ یہ اصول طے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد جس کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جائے گی وہ بیعت سمع و طاعت فی المعروف ہوگی۔ یعنی صرف ایسی باتوں کے ذیل میں امیر کی اطاعت کی جائے گی جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔ شخصی بیعت کے حوالے سے اسلاف سے ہمیں حسبِ ذیل مثالیں ملتی ہیں:

1- خلافتِ راشدہ میں چاروں خلفاء کی خلافت بیعت سمع و طاعت کے نظم پر قائم ہوئی۔

2- دورِ ملوکیت میں حکمران خود کو خلیفہ کہلواتے رہے اور عوام سے بیعت لیتے رہے۔

3- دورِ ملوکیت میں حکومت کے خلاف تحریکیں بیعت کی اساس پر اٹھائی گئیں۔ جن اصحاب نے یہ تحریکیں برپا کیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

i- حضرت حسینؓ بن علیؓ شہادت 61 ہجری دورِ بنو امیہ

ii- حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہادت 73 ہجری دورِ بنو امیہ

iii- حضرت زید بن علی بن حسینؓ شہادت 121 ہجری دورِ بنو امیہ

iv- حضرت محمد بن عبداللہؓ (نفس ذکیہ) شہادت 145 ہجری دورِ بنو عباس

v- حضرت حسین بن علیؓ شہادت 170 ہجری دورِ بنو عباس

4- دورِ غلامی میں غیر مسلم حکومتوں کے خلاف آزادی اور احیائے اسلام کی تحریکیں بیعت کی اساس پر چلائی گئیں۔ لیبیا میں سنوسی تحریک' سوڈان مین مہدی تحریک' نجد میں وہابی تحریک' اور برصغیر پاک و ہند میں تحریک شہیدین کی اساس بیعت پر تھی۔

بیسویں صدی عیسوی میں احیائے دین کیلئے جو تحریکیں شروع ہوئیں ان میں مصر کی الاخوان المسلمون (امیر حسن البنا شہیدؒ) اور برعظیم پاک وھند میں حزب اللہ (امیر مولانا ابوالکلام آزاد) کی بنیاد بیعت پر رکھی گئی۔ 1920ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے تجویز پیش کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے لیکن بعض وجوہات کی بناء پر اس تجویز پر عمل نہیں کیا جا سکا۔ دسمبر 1994ء میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقیؒ کی کتاب ''علامہ اقبال اور مسلمانوں کا سیاسی نصب العین'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے انکشاف کیا اور شواہد پیش کیے کہ علامہ اقبالؒ بھی اپنی زندگی کے آخری دور میں جمعیت شبان المسلمین کے نام سے ایک جماعت بنانا چاہتے تھے جس کی اساس بیعت کے اصول پر قائم کرنے کا ارادہ تھا اور جس کا مقصد دینِ اسلام کا احیاء تھا۔ (ملاحظہ فرمائیے علامہ اقبالؒ کی آخری خواہش' مؤلف: حافظ عاکف سعیدؒ)

☆اجتماعیت کے لیے بیعت کی اساس معقول ہے:

دنیا میں کوئی نظام یا ادارہ چل ہی نہیں سکتا جب تک کے اس میں کوئی ایک ایسا عہدیدار موجود نہ ہو جس کا فیصلہ حتمی یا حرفِ آخر ہو۔ کسی بھی اجتماعیت کے نظم کا تعلق اس کے کام اور ہدف سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اجتماعیت محض خدمتِ خلق' تبلیغ' تدریس' نشر واشاعت وغیرہ کیلئے بنی ہے اور جس میں کسی قوت سے عملی ٹکراؤ کی نوبت آنے کا امکان نہیں ڈھیلا ڈھالا نظام بھی چل سکتا ہے۔ البتہ جہاں معاملہ انقلابی نوعیت کا یعنی نظام کی تبدیلی کا ہو اور کسی دشمن سے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی ہو وہاں تو سمع وطاعت ہی کا نظم نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ دنیا میں آج تک جتنے بھی اہم اور قابلِ ذکر کام ہوئے ان کے پیچھے کسی ایک ہی شخصیت کی رہنمائی وقیادت ہمیں نظر آتی ہے۔ بقول مولانا مودودیؒ:

''کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اس کو ایک شخصیت لے کر چلے جسے تحریک کے اندر بھی دلوں اور دماغوں پر غیر معمولی اثر حاصل ہو اور تحریک کے گردوپیش عام پبلک میں بھی اس کے اثرات پھیلتے چلے جائیں۔ دینی تحریک ہو یا دنیوی' ایک شخصیت کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسلامی تحریک کیلئے انبیاءؑ کی شخصیتیں سامنے لا کر رکھ دیں اور ان کا غیر معمولی وزن اپنی مشیت ہی سے نہیں' اپنے احکام سے بھی قائم کیا۔ انبیاء کے بعد جب اور جہاں بھی کوئی دینی تحریک اٹھی ہے ایک شخصیت کے بل پر اٹھی ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں نے کسی دنیوی غرض کیلئے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی خاطر یہ ایثار کیا ہے کہ اپنا سارا وزن اس کے وزن میں شامل کر کے اس کا وزن بڑھایا اور گردوپیش کی دنیا میں اس کا اثر قائم کیا'' (اقتباس از تحریکِ جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب صفحہ 316' مؤلف: ڈاکٹر اسرار احمدؒ)۔

خلاصہ کلام:

اب تک کی ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ دین اسلام اپنے ہر ماننے والے سے تین مطالبات کرتا ہے یعنی عبادت رب' دعوتِ دین اور اقامتِ دین۔ پھر ان مطالبات کو پورا کرنے کیلئے تین لوازمات کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ پہلا لازمہ جہاد فی سبیل اللہ (مسلسل وپیہم کوشش)' دوسرا لازمہ جماعت (سمع وطاعت والی) اور تیسرا لازمہ یہ جماعت بیعت کی مسنون بنیاد پر قائم واستوار ہو۔ اللہ پاک ہمیں دین کے ان بنیادی تقاضوں کا شعور عطا فرمائے اور ان کو پورا کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ارطغرل غازی.....روشن تاریخ کا ایک ورق!

.....انور غازی

ترکی سے محبت میرے جینز میں' میرے خون میں شامل ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب میرے دادا خلافتِ عثمانیہ کی باتیں کہانی قصوں کے انداز میں سنایا کرتے تھے تاکہ ہم بچوں کو از بر یاد ہو جائیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے تب سے ترکی اور اس کی خلافت کا نام آتے ہی دل میں محبت اور عقیدت کے جذبات امڈ آتے ہیں اور پھر میں اپنی تسکین کیلئے تاریخ کے صفحات پر موجود ترکی' خلافتِ عثمانیہ اور سلاطینِ عثمانیہ کے احوال وواقعات پڑھنے لگتا ہوں۔ یوں دل بہل جاتا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کیا ہے؟ سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ جاننے سے پہلے ہمیں ترک قوم کے بارے میں مختصراً جاننا ہوگا۔ ''ترک'' بہادر' نڈر' جنگجو' عظیم اور فاتح قوم شمار ہوتی ہے۔ ''ترک'' حضرت نوحؑ کے بیٹے ''یافث'' کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت نوحؑ کے تین بیٹے تھے۔ حام' سام اور یافث۔ یافث کے ایک بیٹے کا نام ''ترک'' تھا۔ ترک کی اولاد جب

مشرقی ایشیا، وسطی ایشیا، چین اور ترکستان وغیرہ کے مختلف علاقوں میں پھیلی تو اپنی اولاد اور قوم کو متحد رکھنے، امن وامان قائم کرنے اور انتشار سے بچنے کیلئے ضروری ٹھہرا کہ کوئی سردار مقرر کیا جائے، چنانچہ صلاح مشورے کے بعد ''ترک'' کو بالاتفاق سردار اور بڑا منتخب کرلیا گیا۔ آہستہ آہستہ خاندان اور قبیلے بڑھتے گئے۔ ترک بن یافث کی اولاد میں جتنے بھی قبیلے ہوئے سب کیلئے ''ترک'' کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ یوں رفتہ رفتہ ''ترک'' بہت بڑی قوم بنتی چلی گئی۔

تاریخ کے مطابق ''ترک'' ایک خانہ بدوش قوم تھی۔ یہ مختلف علاقوں میں گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ یہ بہادر، جنگجو اور نڈر تو تھی ہی لہٰذا یہ وقتاً فوقتاً ایشیا اور یورپ کی آبادیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ویران کر دیتی تھیں۔ ترک قبیلے اور ترک قوم نے کئی علاقوں میں چھوٹی بڑی کئی آزاد مملکتیں قائم کرلیں۔ ترکی قبائل میں ''اوغوز قبیلے'' نے خاص شہرت پائی۔ تاریخ میں یہی قبیلہ ''ترک'' کے نام سے مشہور ہوا۔ ترک اور عربوں کے تعلقات کی ابتداء پہلی صدی ہجری میں ہوئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں اسلامی خلافت کی سرحدیں ترکی سے مل گئی تھیں۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کے دورِ خلافت میں ترکی کے کئی علاقوں پر فوج کشی تو ہوئی لیکن فتوحات نہ ہوسکیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن زیاد نے فوج کشی کر کے ترکوں کے کئی اہم علاقے فتح کر لیے۔ ترکستان کے متعدد علاقوں میں کامیابی کے بعد مسلمانوں نے سمرقند، ترمز اور دیگر کئی علاقے بھی فتح کر لیے۔ اموی خلیفہ عبدالملک کے دورِ حکومت میں پورا ترکستان فتح ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دیگر ترکی علاقے بھی اسلامی سلطنت کا حصہ بنے۔ اسی دوران ترکوں نے دینِ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ اموی حکمران حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دینِ اسلام کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی تو ترک جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور پھر رفتہ رفتہ ترکی امراء اور سردار بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ چوتھی صدی ہجری تک ترکوں میں اسلام کا غلبہ ہو چکا تھا۔ ترکستان کی فتح کے نتائج دور رس نکلے۔ ترک سرداروں کے مسلمان ہونے سے اس سرزمین میں اسلام کے قدم جم گئے۔ دینِ اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ رفتہ رفتہ ترکوں نے سیاست میں قدم رکھنے شروع کر دیے۔ ترک جب باقاعدہ طور پر سیاست میں آئے تو اس وقت عباسی خلافت کے ابوجعفر منصور حکمران تھے۔ ابوجعفر منصور نے بعض ترکوں کو سلطنت کے عہدے دے دیے۔ عباسی خلیفہ معتصم نے ترکوں کو کئی عہدے اور وزارتیں دیں اور پھر ترکوں کا اثر ورسوخ حکومتی معاملات میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کے بعد کئی ترک حکمران خاندانوں نے عالمِ اسلام کے وسیع وعریض خطے پر حکومت کی۔

''سلیمان شاہ'' سلطنتِ عثمانیہ کے پہلے حکمران ''عثمان خان غازی'' کا دادا تھا۔ اس کا تعلق ترک قبیلے ''اوغوز'' سے تھا۔ سلیمان شاہ کے چار بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کا نام ''ارطغرل'' تھا۔ ارطغرل بہت ہی بہادر، نڈر، جنگجو، شجاع اور سچا مسلمان تھا۔ آپ جانتے ہیں ترک قبیلہ خانہ بدوش تھا۔ ان کا کوئی ایک ٹھکانہ نہ تھا۔ ارطغرل غازی بھی اپنے خاندان اور ساتھیوں کے ساتھ کسی نئے مقام کی طرف آباد ہونے کی غرض سے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ارطغرل نے انگورہ (انقرہ) کے مقام پر دو متحارب فوجوں کو جنگ کرتے ہوئے دیکھا۔ ارطغرل نے اپنی فطری ہمدردی کی بناء پر کمزور فوج کا ساتھ دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ارطغرل نے اپنے ساتھیوں سمیت مخالف فوج پر ٹوٹ پڑا۔ اس بہادری اور جانثار سے لڑا کہ مخالف فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ وہ کمزور فوج جس کا ارطغرل نے ساتھ دیا تھا، وہ سلجوقی سلطان علاء الدین کی تھی۔ یہ کچھ لمحے پہلے تک منگولوں کے ہاتھوں اپنی شکست اور ہلاکت کو یقینی سمجھ رہا تھا۔ غیر متوقع مدد اور کامیابی سے علاء الدین ''ارطغرل'' سے بہت خوش ہوا۔ اور خدمت کے اعتراف میں خوش ہو کر ارطغرل اور اس کے خاندان کو انقرہ (انگورہ) کے مقام پر ''قروچہ'' نامی علاقہ الاٹ کر دیا۔ یہ علاقہ جو ارطغرل کو دیا گیا یہ بازنطینی سرحد کے بالکل قریب تھا۔ رومی ہر وقت سلجوقی علاقوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اب وہ خاموش ہو گئے بلکہ ترکوں سے ڈرنے لگے، چنانچہ ارطغرل نے رومیوں پر حملہ آور ہو کے ان کو دور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یوں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ چل نکلا اور ترکوں کو مستقل ایک جگہ مل گئی۔

ارطغرل کا 90 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ارطغرل کے 3 بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کا نام عثمان تھا۔ عثمان کے نام سے ترکوں کو شہرت ملی۔ ارطغرل کا یہی وہ بہادر، نڈر، دور اندیش اور سعادت مند بیٹا تھا جس کے نام پر ترکمانی حکومت کو ''عثمانی حکومت'' کا نام دیا گیا۔ ہوا یوں کہ جب سلجوقی حکمران علاؤالدین کی جگہ اس کا بیٹا غیاث الدین حکمران بنا تو اس نے اپنی بیٹی کی شادی ارطغرل کے بیٹے عثمان سے کر دی۔ عثمان چونکہ بہت صلاحیتوں کا مالک تھا چنانچہ عثمان نے اپنے والد ارطغرل کے علاقوں کا انتظام و انصرام بہت منظم اور مضبوط کر دیا۔ اپنے علاقوں کی حفاظت کیلئے بہترین فوج تشکیل دی۔ ادارے بنائے۔ نظام بنایا۔ جس وقت ارطغرل کا بیٹا اور جانشین عثمان ''سلطنتِ عثمانیہ'' کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس وقت اسلامی سلطنتیں انتہائی کمزور اور ابتر حالت میں تھیں۔ مصر متعدد سلاطین کے قبضے میں تھا۔ شام میں ایوبی سلاطین نے الگ الگ کئی خودمختار سلطنتیں بنا رکھی تھیں۔ عراق اور فارس ایلخانی حکمرانوں کے قبضے میں تھا۔ ماوراء النہر افغانستان وغیرہ پر مغلوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں دہلی کے بادشاہ راج کرتے تھے۔ اندلس میں ''دولت ناصری'' کا تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا۔ ارطغرل کا بیٹا عثمان چونکہ عالمی حالات سے واقف تھا۔ ذہین اور دور اندیش تھا، لہٰذا وہ حالات

کو بھانپ گیا اور اس نے اس خلا کو پر کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ سلطنتِ عثمانیہ وسیع در وسیع ہوتی چلی گئی۔ ''اخی تحریک'' شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ آپس میں اتحاد اور بھائی چارہ قائم کیا جائے گا۔ یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ترک عالمِ اسلام پر حکمرانی کرنے لگے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کی خلافت اور اہم کارنامے

.....مولانا زاہد الراشدی

سیدنا صدیق اکبرؓ کی حیات مبارکہ، مقام و فضیلت اور خلافت و حکومت کے حوالہ سے گفتگو کے بیسیوں پہلو ہیں اور ہر ایک میں ہمارے لیے سبق اور راہنمائی موجود ہے، مگر آج حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے عنوان سے تین چار سوالات کا مختصر جائزہ لینا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ خلافت کسے کہتے ہیں؟ دوسرا یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ کس نے بنایا تھا؟ تیسرا یہ کہ ان کی خلافت کی نظریاتی بنیاد کیا تھی؟ اور چوتھا یہ کہ بحیثیت خلیفہ انہوں نے کون سے اہم کارنامے سرانجام دیے؟

(۱) خلافت ایک طرزِ حکومت کا نام ہے جو آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ سے قبل دنیا میں دو طرح کی حکومتیں رہی ہیں۔ وہ حکومتیں جو طاقتور لوگوں نے خود قائم کیں اور طاقت کے زور پر انہیں چلاتے رہے، اس کا سب سے بڑا عنوان بادشاہت ہے۔ اور دوسری یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ نے اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام کو معاشرے میں نافذ کرنے کیلئے حکومتیں قائم کیں جن میں حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یوشع بن نون علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی حکومتوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں اقتدار انبیاء کرام کے پاس ہوتا تھا، ایک پیغمبر دنیا سے چلے جاتے تو دوسرے آ جاتے، لیکن میرے بعد چونکہ کوئی نبی نہیں آئے گا اس لیے اب خلفاء ہوں گے جو سیاسی نظام کو چلائیں گے۔ اس کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے امت کو ان خلاف و عظام کی پیروی کی ہدایت فرمائی۔ گویا خلافت دنیا میں آسمانی تعلیمات کے نفاذ و ترویج کے نظام کا نام ہے جو پہلے انبیاء کرام قائم کرتے تھے، جبکہ آنحضرت ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو جانے کے باعث اس نظام کو چلانے کیلئے خلافت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھنے کی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہوتے تھے اس لیے ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کی خلافت سمجھی جاتی تھی، مگر جناب نبی اکرم ﷺ کے بعد خلافت کے منصب پر فائز ہونے والے حضرات چونکہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست نمائندے نہیں ہیں اس لیے یہ خلافت جنابِ رسول اللہ ﷺ کی نیابت کہلاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ الرسول ﷺ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے حتیٰ کہ امام ابو یعلیٰ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو کسی نے ''خلیفۃ اللہ'' کہا تو انہوں نے یہ فرما کر ٹوک دیا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ اس طرح خلیفہ کو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ قرار دینے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ بنا کر اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ حکومت و انتظام میں سنت رسول کا پابند ہے اور امام معصوم یا پاپائے روم کی طرح احتساب اور تنقید و اعتراض سے بالاتر نہیں ہے۔

(۲) دوسرا سوال کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ کس نے بنایا تھا؟ اس پر عرض کروں گا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں آپؐ کے واضح طرزِ عمل اور اشارات کے باعث لوگ سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے مگر نامزد نہیں فرمایا تھا۔ جس کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس طرح جانشین نامزد کرنا تا قیامت تک کے لیے قانون بن جاتا اور امت کی رائے اور صوابدید کی نفی ہو جاتی۔ اس لیے نبی اکرم نے اشارات کے باوجود خلافت کے معاملہ کو کھلا چھوڑ دیا اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد مختلف مجالس کی عمومی بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو اجتماعی طور پر خلیفہ چنا گیا۔ چنانچہ یہ کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ کو امت نے اجتماعی رائے سے خلیفۃ الرسول منتخب کیا تھا اور فقہاء کرام نے اسی وجہ سے خلیفہ کے انتخاب میں امت کی اجتماعی صوابدید کو سب سے بہتر طریقہ قرار دیا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد پہلے خطبہ میں چند باتیں واضح فرما دیں تھیں جن میں سے ایک کا تذکرہ کروں گا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کا نظام چلاؤں گا اور ان کا پابند رہوں گا۔ پھر فرمایا کہ اگر اس سے ہٹ کر چلوں تو لوگوں پر میری اطاعت واجب نہیں ہے اور انہیں احتساب کا حق حاصل ہوگا۔ گویا خلافت کا نظام قرآن و سنت کی پابندی اور عوام کے حق احتساب کے دو اصولوں پر استوار ہے۔ اس لیے خلیفہ کسی بادشاہ کی طرح مطلق العنان ہونے کی بجائے

قرآن وسنت کا پابند اور عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اڑھائی سالہ مختصر دور میں جو نمایاں کارنامے سرانجام دیے ہیں ان کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ:

☆ رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد منکرینِ ختمِ نبوت، منکرینِ زکوٰۃ اور مرتدین کے مختلف گروہوں نے بغاوت کر کے ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا تھا اور عالم اسباب میں نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ ریاست وحکومت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ان سب کا مقابلہ کر کے حضرت ابوبکرؓ نے اسلامی ریاست وحکومت کو استحکام بخشا اور پوری استقامت کے ساتھ امت کے داخلی اتحاد کو قائم رکھا جو ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

☆ قرآن کریم جناب نبی اکرم ﷺ کے دور میں سینکڑوں حفاظ کو یاد تھا اور ہر لحاظ سے مکمل ومرتب طور پر محفوظ تھا البتہ کتابی شکل میں نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ کی تحریک پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن حارثؓ سے قرآن کریم تحریری صورت میں لکھوا کر اسے مسجدِ نبویؐ میں رکھوا دیا جس سے قرآن کریم کتابی شکل میں محفوظ ہو گیا اور اس میں کسی تحریف اور ردوبدل کا دروازہ بند ہو گیا کہ مسجد نبوی میں موجود سرکاری اور اسٹینڈرڈ نسخہ کی موجودگی میں کسی کو جرأت نہیں تھی کہ وہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کر کے اسے عام کر سکے۔

☆ نبی اکرم ﷺ نے بیت المال کا نظام قائم کر کے ریاست کے عام شہریوں بالخصوص معذوروں اور مستحقین کی کفالت کا جو نظام دیا تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور ایسی بنیادیں فراہم کر دیں جس سے رفاہی ریاست اور ویلفیئر اسٹیٹ کا وہ نظام حضرت عمرؓ کے دور میں منظم ہو کر دنیا کیلئے ایک مثالی اور آئیڈیل رفاہی نظام کی شکل اختیار کر گیا۔